فلسفیانہ بصیرت اور عصری احساس کا شاعر فرید پربتی

سرزمین کشمیر تخلیقی اظہار اور عبادت و ریاضت کے لیے ہمیشہ سے زرخیز رہی ہے۔شاید یہاں کے حسین مناظر، برف سے ڈھکی پہاڑوں کی چوٹیاں اور سنسان گپھائیں تخلیقی عمل اور تپسیا کے لیے بہت محرک (Inspirational) ہیں۔سنسکرت کے عظیم شاعروں اور ادیبوں میں مہا کوی کالی داس، اچاریہ ممٹ، ابھینو گپت اور فارسی کے شعرا میں غنی کشمیری، شیخ یعقوب صرفی کشمیری، شیخ علی پمپوری، پنڈت نندرام (جنہوں نے اپنشد کو فارسی میں ترجمہ کیا تھا) اور بابا نصیب الدین غازی وغیرہ جیسی شخصیتیں یہیں پیدا ہوئیں۔علامہ اقبال اور چکبست جیسے عظیم شاعروں کا تعلق بھی اسی سرزمین سے تھا۔مابعد جدید عصر میں فرید پربتی بھی کشمیر کے عظیم شعرا کے کہکشاں میں سے ایک تھے جنھوں نے آٹھ شعری مجموعے اور پانچ تنقیدی و تحقیقی تصانیف سے اپنی شناخت عالمی سطح پر مستحکم کر لی تھی۔

نقاد، محقق کی حیثیت سے بھی ان کی ایک الگ پہچان تھی مگر شاعری سے بھی ان کا رشتہ بہت مضبوط تھا۔خاص طور پر رباعیات میں فرید پربتی نے ایسے تجربے کیے جس کی داد اہل نظر نے دل کھول کر دی۔فرید پربتی نے اپنے کلیات کا نام ''ہجوم آئینہ'' شاید اس رعایت سے رکھا کہ یہ کائنات بھی 'ہجوم آئینہ' ہے جس میں خدا کی تمام صفات منعکس ہوتی رہتی ہیں۔اسی طرح فرید پربتی کی شاعری کے تمام رنگ ''ہجوم آئینہ'' کے اشعار میں منعکس ہوتے رہتے ہیں۔ان رنگوں میں جو رنگ سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ ''روشنی'' ہے۔روشنی میں سات رنگ ہوتے ہیں جو Thunder Storm کے بعد قوس وقزح میں نظر آتے ہیں یا پھر 'پرزم' میں۔یعنی روشنی سات رنگوں کا مرکب ہے۔آفتاب و ماہتاب کی روشنی تیز رفتاری کی بدولت چند لمحوں میں چاروں طرف پھیل جاتی ہیں اور پوری دنیا کو روشن کر دیتی ہیں۔یعنی جہاں روشنی ہے وہاں اس کے سات رنگ بھی ہیں اور رفتار بھی۔سورج، چاند اور ستارے روشنی کی علامات ہیں جو دل کی تاریکیوں کے ساتھ ساتھ کائنات کی تمام اشیا کو منور کر دیتے ہیں۔

فرید پربتی کو چاند، ستاروں اور ان کی روشنیوں سے نہ صرف بے حد محبت تھی بلکہ ایک عجب سا روحانی رشتہ بھی تھا۔شاید اسی لیے انہوں نے چاند اور ستاروں کا استعمال اپنے اشعار میں کثرت سے کیا ہے اور اپنے ایک مجموعۂ کلام کا نام بھی ''گفتگو چاند سے'' رکھا ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرید پربتی ''روشنی، رنگ اور رفتار'' کے شاعر ہیں۔ان کے اشعار کی روشنی میں چاند اور ستاروں سے ان کی ذہنی یا روحانی وابستگی کی وجوہات پر غور و فکر کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ تو دراصل زندگی کے بلند ترین مراتب اور زیادہ سے زیادہ تجلی حاصل کرنا چاہتے تھے کیوں کہ یہی انسان کا نصب العین ہے۔فرید پربتی کو چاند، ستارے اور ان کی روشنی سے کتنی محبت تھی، اس کا ادراک ان اشعار سے ہوتا ہے:

بھاتا ہے مجھ کو چاند نظارا سرِ فلک
ہر پھر کے آرہا ہوں دوبارا سرِ فلک
نکلا تھا گھر سے ڈھونڈنے میں اپنے آپ کو

آیا نظر نہ کوئی ستارا سرِ فلک
اک جلوۂ مہتاب ہے تشہیر میں شاید
گم ہوگیا ہوں اپنی ہی تعبیر میں شاید

ایک رباعی بھی ملاحظہ کیجئے:

پُرہول مناظر سے، گزرنا بھی پڑا
نادیدہ مقاموں پہ، ٹھہرنا بھی پڑا
اے روشنیٔ جاں، تجھے پانے کے لیے
جینا بھی پڑا ہے، مجھے مرنا بھی پڑا

فلسفیوں کے مطابق چاند اور ستاروں میں جو روشنی پائی جاتی ہے اسے نورِ عارضی یا نورِ حادث سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ نور کی دو قسمیں ہوتی ہیں نورِ مجرد (یعنی روح) اور نورِ عارضی یا نورِ حادث۔ نورِ مجرد کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔ نورِ مجرد سے نور کی مختلف نیم شعوری، شعوری اور بالذات صورتیں ابھرتی ہیں۔ شعور یا علمِ ذات، نورِ مجرد کا جوہر ہے۔ جبکہ نورِ عارضی کی کوئی نہ کوئی صورت ہوتی ہے جو اپنے علاوہ بھی کسی چیز کی صفت بن جانے کی صلاحیت رکھتا ہے جیسے چاند اور ستاروں کا نور۔ اس نور کو نورِ محسوس بھی کہا جاتا ہے جو دراصل نورِ مجرد ہی کا عکسِ بعید ہے۔ کائنات دراصل بے پناہ تجلّیوں کی شعاعوں کا ایک سایہ ہے۔ ان تجلّیوں کی وجہ سے کائنات کی اشیا مستقل حرکت میں رہتی ہیں اور ان میں ایک عشق کا جذبہ نمو پاتا رہتا ہے تاکہ وہ حقیقی سرچشمۂ نور سے مستفیض ہوتی رہیں۔ عشق، نورِ مجرد (روح) اور جسم کے درمیان ذریعۂ اتحاد کے طور پر کام کرتا رہتا ہے۔ جو جسم تجلی کا خواہش مند ہوتا ہے وہ روح کے وسیلے سے اسے حاصل کرتا ہے کیوں کہ روح، جسم اور سرچشمۂ نور کے درمیان براہ راست تعلق قائم کر دیتی ہے لیکن روح اس نور کو جو یہ براہ راست حاصل کرتی ہے تاریک اور ٹھوس جسم میں منتقل نہیں کر سکتی کیوں جسم اپنی صفت کے اعتبار سے ہستی کی ایک مخالف سمت میں واقع ہے۔ ان دونوں میں تعلق پیدا کرنے کے لیے ایک واسطہ کی ضرورت ہے۔ یہ واسطہ ایک ایسی چیز ہے جو نور اور ظلمت (یا جسم) کے درمیان واقع ہے۔ یہ واسطہ روح حیوانی ہے۔ یہ ایک گرم، لطیف اور شفاف بخار ہے جس کا مخصوص مقام قلب کی بائیں جانب ہے۔ لیکن یہ پورے جسم میں گردش بھی کرتا ہے۔ چونکہ روح حیوانی اور نور میں ایک جزوی مماثلت بھی ہے اس لیے تاریک راتوں میں بحری جانور آگ کی روشنی کی طرف لپکتے ہیں اور سمندری جانور پانی سے نکل کر چاندنی رات کے دلنشیں مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے باہر خشکی پر نکل آتے ہیں۔ مختصر یہ کہ زندگی کے بلند ترین مراتب طے کرنا اور زیادہ سے زیادہ تجلی حاصل کرنا انسان کا نصب العین ہے اور اس طرح سے وہ بتدریج ظاہری دنیا سے مکمل نجات پالیتا ہے۔ فرید پربتی کی چاند، ستاروں اور ان کی روشنی سے غیر معمولی محبت اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے قلب کی بائیں جانب جو روح حیوانی موجود تھی وہ بے حد بیدار تھی شاید اسی لیے وہ زیادہ سے زیادہ تجلی حاصل کرنے کے متمنی تھے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

آتے ہیں نظر خواب میں چاند اور ستارے
ہے گھر سے نکلنا مری تقدیر میں شاید
تاروں کی جھرمٹ میں لگی لو چاندنی پھر جھومنے
سونا بکھرتی دم بدم، اللہ بس، باقی ہوس
جانے کس سوچ میں بیٹھی ہے ستاروں کی قطار
چاندنی دیر سے کہتی ہے سراپا ہو جاؤں
دل و جگر میں اُترتی ہے کہکشاں کی قطار

یہ چاند رات کہاں اب گزارنے جاؤں

دراصل اشراقی فلسفہ کے مطابق نور اعلیٰ تمام حرکات کا مبدا ہے اور حرکت کا سبب منور کرنے کی خواہش ہے اور یہی وہ خواہش ہے جو نور کو مضطرب کر دیتی ہے تا کہ یہ اپنی شعاعوں کو تمام چیزوں پر منعکس کر کے ان کی زندگی میں ایک روح پھونک دے۔اس سے جو تجلیات نمو کرتی ہیں ان کی تعداد لامحدود ہوتی ہے اور ایسی تجلیات جن کی روشنی شدید ہوتی ہے وہ دوسری تجلیات کا سرچشمہ بن جاتی ہیں۔گویا یہ کائنات ایک سایہ ہے ان بے پناہ تجلیوں کی شعاعوں کا جو نور اعلیٰ سے آتی ہیں۔کائنات کی اشیا میں ان تجلیوں کے سبب جن کی جانب یہ مستقل حرکت میں رہتی ہیں ایک عشق کا جذبہ نمو پاتا رہتا ہے تا کہ وہ حقیقی نور کے سرچشمہ سے مستفیض ہوتی رہیں۔یعنی یہ کارخانۂ عالم محبت وعشق کا ابدی ڈرامہ ہے۔اسی لئے فرید کی شاعری میں عشق ایک ہمہ گیر تخلیقی جذبہ ہے اور عشق کی گرمی سے ہی معرکۂ کائنات ہے۔علامہ اقبال نے بھی کہا ہے:

عشق کی اک جست نے طے کردیا قصّہ تمام
اس زمیں وآسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

مختصر یہ کہ عشق سے روشنی کا شعور حاصل ہوا اور تنویر نگاہ سے کائناتی جلوؤں کی پہچان ہوئی اور لامکاں کی روشنیوں کا ادراک حاصل ہوا۔فرید کی شاعری میں چاند، کہکشاں اور ستاروں کی قطار، بطور استعارہ استعمال ہونے کے پیچھے ''روشنی'' کا 'آرچ ٹائپ' حددرجہ متحرک ہے۔چاند اور ستاروں سے متعلق چند اور اشعار ملاحظہ کیجئے:

ہوئے ہیں چاند ستاروں کے ساتھ خواب ہوا
میں ہوگیا ہوں بہت ہی غریب آخرِ شب
چاند کی پہلی کرن پوچھنے آتی ہے حال
جب یہاں کوئی نہیں ہوتا ہے تب پوچھتی ہے
دل کی وسعت کے لیے چاند ستارے کم ہیں
اکتفا کس پہ کروں میری طلب پوچھتی ہے
چہرہ پردے سے جو اُس رشکِ قمر کا نکلا
ہر کوئی کہنے لگا چاند کدھر کا نکلا
میری راتوں کو ستاروں سے سجانے والا
ڈھونڈے آج پتہ وقتِ سحر کا نکلا
چاندنی رات تھی تارے تھے کوئی کہتا تھا
اس طرح مجھ کو مجھی سے نہ چُرا یاد آیا
اک ستارے کو ضیا بار دکھانے کے لیے
وہ بجھائیں گے سبھی شمس و قمر جانتے ہیں
کسی جھولی میں یہ تارے ہی نہیں گرنے کے
یہ طلب گار کا اندازِ نظر جانتے ہیں
دیا ہے جاگتے تاروں نے بے مہار سا کرب

بنا گئے ہیں مجھے خود کفیل راتوں رات
رونق دنیا ہے باقی میں ہی لیکن بجھ گیا
چاند ہے بھرپور تارے میں چمک باقی نہیں
خواب میں دیکھی تھی اک ایسی جگہ یاد آ گیا
رکھ گیا چاند ستارے وہ سبھی اپنے پاس
جڑ پکڑ کر رہ گیا آنکھوں میں کربِ انتظار
بے کراں تاریکیوں میں تارے گنتے رہ گیا

فرید پربتی نے چاند اور ستاروں کے ساتھ ساتھ حیات و کائنات سے بھی محبت کی، ان کا مشاہدہ کیا اور پھر کائنات کے رمز کو آشکار کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے صوفیوں سے بھی محبت کی اور صوفیانہ افکار سے اپنی زندگی کو آراستہ کیا جس کا عکس ان کی شاعری میں بھی موجود ہے۔ چونکہ فرید پربتی کی پرورش صوفیانہ ماحول میں ہوئی تھی۔ ان کے والد بھی صوفیوں اور صوفیانہ اقدار سے محبت کرتے تھے۔ فرید پربتی نے ہجوم آئینہ کے دیباچہ میں خود ہی لکھا ہے:

''میری تربیت صوفیانہ ماحول میں ہوئی۔ جس شخص نے میرے کان میں اذان دی وہ صوفی تھا۔ میرے منہ میں پہلا چمچہ ڈالنے والا بھی صوفی تھا۔ میرے والد صوفیت کے زبردست دلدادہ تھے مگر میں نے اپنے اوپر صوفیت کو حاوی ہونے نہیں دیا، تصوف کے سات دروازے ہیں، میں چھ سے گذر چکا ہوں۔ اگر ساتواں عبور کیا ہوتا تو میں اپنے مریدوں کے درمیان ہوتا یا کسی گوشۂ عزلت میں۔''

فرید پربتی تصوف کے جن سات دروازوں کا ذکر کیا ان میں بقول خواجہ فریدالدین عطار پہلا دروازہ وادیٔ طلب، دوسرا وادیٔ عشق، تیسرا وادیٔ معرفت، چوتھا وادیٔ استغنا، پانچواں وادیٔ توحید، چھٹا وادیٔ حیرت اور ساتواں وادی فنا ہے۔

فرید پربتی کے آبائی مکان جو سنگین دروازہ کے پاس واقع تھا۔ اس کے بالکل نزدیک ہاری پربت ہے جس کی مناسبت سے وہ اپنے نام کے ساتھ پربتی لکھتے تھے۔ اسی پہاڑی پر فرید پربتی کے پیر حضرت سلطان شیخ حمزہ کا درگاہ ہے جو ان کے گھر سے نظر آتا تھا۔ فرید پربتی کو حضرت سلطان شیخ حمزہ سے بے حد عقیدت و محبت تھی۔ اگر انہوں نے پیری اور مریدی کا سلسلہ جاری رکھا ہوتا تو یقیناً وہ اپنے مریدوں کے درمیان گھرے ہوتے۔ فرید پربتی ان سے اپنی عقیدت و محبت کا اظہار اکثر اپنے اشعار میں کیا ہے:

اک چشم کیمیاء کا طلب گار ہے فریدؔ
محروم فیض حضرتِ سلطاںؒ نہ رکھ مجھے
جاتا ہوں شیخ حمزہؒ کے در پر فریدؔ پھر
بابِ قبول رہتا نہیں ہے وہاں بند
اُس کے کاندھے پہ پرانی سی پھٹی چادر تھی
دے گیا تھا وہی جینے کی دعا یاد آیا

نہ جانے صوفیوں سے عقیدت و محبت کا اثر ہے یا حضرتِ علیؑ کے اس قول کا اثر ہے کہ 'خود شناسی ہی خدا شناسی ہے' یا پھر تصوف کے سات دروازوں میں سے

چھٹے دروازے سے گذرنے کا اثر ہے کہ فرید پربتی صوفیوں کی طرح حقیقت حق اور حقیقت کائنات کا راز فاش کرنے کی جستجو کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وحدت الوجود کے سب سے بڑے پیروکار اور صوفی ابن عربی نے لکھا ہے کہ انسان خدا کا آئینہ ہے اور خدا انسان کا۔ اسی لئے فرید پربتی خدا سے ملنے کے لیے پہلے اپنے آپ سے ملنے کے خواہاں ہیں:

یہ طلسم ذات میں چھوڑ کر مرا میں کدھر کو چلا گیا
کہ مَیں اپنے آپ سے مل سکوں ہے تلاش آج تلک مجھے
میں خواہاں خود سے ملنے کا بہت ہوں
مگر یہ مرحلہ دشوار نکلا
ڈھونڈنے نکلا ہوں اپنے آپ کو
کوئی کہتا تھا مجھے اپنا تو بَن

خود کو پہچاننے کا عمل اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ اس کے لیے عشق کی ضرورت ہے اور عشق تو ایک آگ کا دریا ہے جس میں ڈوب کر جانا ہوتا ہے۔ فرید پربتی نے مرحلۂ عشق کو سر کیا اور عشق سے انہیں روشنی کا شعور حاصل ہوا اور تنویر نگاہ سے کائناتی جلوؤں کی پہچان ہوئی اور لامکاں کی روشنیوں کا ادراک حاصل ہوا اس کے بعد آگ، پانی اور ہوا سب پر غالب ہو گئے۔ اس لیے وہ کہتے ہیں:

کندن سا دمکتا ہے مرا روحِ وجود
میں عشق ہوں اور عشق کا قالب ہوں
پروانہ صفت، نور کا میں طالب ہوں
مٹّی ہے خمیر، آگ پہ میں غالب ہوں

اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد انسان اپنی ذات سے مل سکتا ہے اور اپنی ذات سے ملنا خدا سے ملنے کے مترادف ہے۔ خدا سے ملنے کے بعد تو انسان دنیا و مافیہا سے خود کو الگ محسوس کرتا ہے:

سکوتِ مرگ نہ شورِ ثبات سے مجھ کو
ملا رہا ہے کوئی میری ذات سے مجھ کو
فسونِ ذات، شعورِ حیات سے مجھ کو
جدا وہ کرتا ہے ہر کائنات سے مجھ کو

حقانی القاسمی نے بھی فرید پربتی کی شاعری میں صوفیانہ عناصر کی موجودگی اور فنافی العشق کے جذبے کی طرف اشارے کیے ہیں۔ انہوں نے ''فرید نامہ'' کے پیش لفظ میں لکھا ہے:

''فرید پربتی کے اشعار صوفیانہ سوچ کے مظہر ہیں۔ فنافی الشعر فرید فنافی العشق کے مقامات کی سیر کراتے ہیں۔ ان کا ذہن غیر مشروط ہے۔ اس لیے ان کا فکری تناظر بھی وسیع ہے۔ انہوں نے اثبات کے ذریعے عشق و عرفاں کی بہت سی منزلوں اور مقامات کو طے کیا ہے۔''

فرید پربتی کی شاعری میں خواب کا استعمال کثرت سے ہوا ہے۔اس کے نفسیاتی پہلوؤں پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی ہزاروں خواہشیں ایسی ہوتی ہیں جن کی تکمیل نہیں ہو پاتی ہے۔ایسی خواہشیں مرتی نہیں ہیں بلکہ دب جاتی ہیں اور اس کے لاشعور کا حصہ بن جاتی ہیں۔انسان ان خواہشوں کو رات میں سونے کے بعد خواب میں دیکھتا ہے یا محسوس کرتا ہے۔کبھی انسان ان دبی ہوئی خواہشوں کو عالم بیداری میں بھی دیکھتا ہے جسے فنٹاسی یعنی جاگتی آنکھوں کا خواب سے تعبیر کرتے ہیں۔اس لیے کہا جاتا ہے کہ خواب اور فنٹاسی ایک ہی سکّے کے دو رخ ہیں۔رات کے خواب یا دن کی جاگتی آنکھوں کے خواب کا اظہار ہم اکثر نہیں کر پاتے ہیں کیوں کہ خواب اور فنٹاسی میں کبھی کبھی ایسی خواہشیں جاگ جاتی ہیں جن کا ذکر کرتے ہوئے ہم شرمندگی محسوس کرتے ہیں کیوں کہ ان کا تعلق ہمارے بچپن کی خواہشوں سے ہوتا ہے جن کا اظہار زمانۂ طفلی میں تو اچھا لگتا ہے لیکن بڑے ہو جانے کے بعد ان خواہشوں کا اظہار کرتے ہوئے ہم شرم محسوس کرتے ہیں اس لیے ہم انہیں سختی سے دبا دیتے ہیں لیکن ان دبی ہوئی خواہشوں کا اظہار مسخ شدہ حالت میں ہوتا ہے جو آسانی سے ہماری سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ جس طرح رات میں ہماری دبی ہوئی خواہشیں تسکین پاتی ہیں اسی طرح دن کے خوابِ بیداری میں دبی ہوئی خواہشیں تسکین پا جاتی ہیں۔

ایک تخلیق کار یا شاعر جب تخلیقی عمل سے گزرتا ہے تو اپنے لیے ایک فنٹاسی کی دنیا خلق کرتا ہے۔فرائڈ کا خیال ہے کہ فنٹاسی میں تینوں زمانے ماضی، حال اور مستقبل موجود ہوتے ہیں۔زمانۂ حال میں تخلیق کار کا کوئی شدید تجربہ ماضی میں گزرے ہوئے تجربے اور ان کی تکمیل کی خواہش کو پھر سے جگا دیتا ہے جس کی تکمیل وہ اپنی تخلیق میں ڈھونڈ لیتا ہے اور اس کا اظہار اپنی تخلیق میں جمالیاتی عنصر کے ساتھ کرتا ہے جس سے قاری محظوظ ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ میرے ہی خوابوں کی تعبیر ہے۔فرید پربتی نے بھی ماضی کی اپنی پرانی خواہشوں کو زمانۂ حال سے ہم آہنگ کر کے اپنی شاعری میں پیش کیا اور اپنے پیرایۂ اظہار میں جمالیاتی عناصر کو بھی شامل کیا جس سے ان کے اشعار میں دلکشی پیدا ہو گئی ہے۔چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

کس نے رکھی ہے مری آنکھوں میں خوابوں کی قطار
کون خواہش دل کی جاتا ہے جواں کرتا ہوا

تسلسل ٹوٹتے خوابوں میں پیدا کر گئی دنیا
نئے انداز سے شعلے نگہ میں بھر گئی دنیا

نہیں دور ہے خواب سے کیوں حقیقت
میں تفصیل اِس کی سناؤں گا اک دن

وہم و یقیں یکساں ہیں میرے لیے
خوابوں کا میں، ملبوس ہوں حیران ہوں

مَیں خوابوں کی شمعیں جلاؤں گا اک دن
زمیں پر ستاروں کو لاؤں گا اک دن

جانے کس سمت لیے جاتا ہے خوابوں کا بھنور
دائرہ دائرہ ہر موج سے پیدا ہو جاؤں

لے کے نکلا ہوں میں پھر سوختہ خوابوں کا جلوس
خود تماشائی بنوں خود ہی تماشا ہو جاؤں

خوابوں کے بعد فرید پربتی کے اشعار میں 'ہَوا' کا استعمال بھی کثرت سے ہوا ہے۔ہوا کے کثرتِ استعمال کے پیچھے کون سی سائیکی تھی یہ جاننے کے لیے

ہوا کے اساطیری پہلوؤں پر غور کرنا ضروری ہے۔ دراصل 'ہَوا' کو سنسکرت میں 'وایُو' کہا جاتا ہے۔ ہندوؤں کے ابتدائی ہمہ اوست نظریے کے مطابق 'وایُو' ہَوا کا دیوتا ہے جسے کافی عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا کیوں کہ وہ تمام دیوتاؤں میں سب سے زیادہ طاقتور اور اہم تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں تمام دیوتاؤں کی زندگی تھم جاتی تھی کیوں کہ زندہ رہنے کے لیے سانس لینا ضروری ہے۔ 'وایُو' کو سنسکرت میں 'پران' یا 'پَون' بھی کہا جاتا ہے یعنی پاک کرنے والا۔ 'وایُو' اکثر بے حد حسین وجمیل شخص کی نمائندگی کرتا ہے اور جس کے رتھ کو ہلکے جامنی اور سفید رنگوں کے ہزاروں گھوڑے تیز رفتار سے کھینچتے ہیں لیکن جب وہ رتھ پر سوار نہیں رہتا ہے تو پھر ہرن کی سواری کرتا یعنی یہ رفتار کی بھی علامت ہے۔ 'وایُو' کو طوفان برپا کرنے والا دیوتا کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے ایک دفعہ 'وایُو' غصّے کے عالم میں اساطیری پہاڑ 'میرو' کی چوٹی کو اڑا کر لے گیا اور اسے سمندر میں ڈال دیا جسے موجودہ دور میں سری لنکا کہا جاتا ہے۔ 'وایُو' اپنے ہَوس کے لئے بھی کافی مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بندروں کا دیوتا ہنومان 'وایُو' کا بیٹا ہے جسے ہوا میں اڑنے کی 'وردان' (تحفہ) 'وایُو' ہی نے دیا تھا۔ مہابھارت کا ہیرو بھیم بھی 'وایُو' کا ہی بیٹا تھا۔ بھیم سراپا طاقت تھا تو ہنومان طاقت کا دیوتا تھا۔ مختصر یہ کہ ہوا بنیادی طور پر طاقت کی علامت ہے۔ یہ تمام زی روح کو زندہ رکھنے میں اہم رول ادا کرتی ہے۔ یہ باغوں میں ٹھنڈک کا احساس دلاتی ہے تو صحراؤں میں تپش کا۔ یہ سمندر میں کشتیوں کو منزل مقصود تک پہچانے میں مدد کرتی ہے تو کبھی سمندروں میں طوفاب برپا کر کے کشتیوں کو غرق آب بھی کر دیتی ہے۔ یہ پتوں اور پودوں کو ہرا بھرا رکھنے میں مدد بھی کرتی ہے اور غصہ کے عالم میں بڑے بڑے تناور درختوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتی ہے۔ غرض یہ زندگی کی بھی علامت ہے اور تخریبی طاقت کی بھی۔ اس لیے شاعری میں اس کا استعمال دونوں معنوں ہوا ہے۔ شاعری میں صبح کی ٹھنڈی ہوا اپنی لطافت سے کلیوں کو گدگدا دیتی ہے تو کلیاں پھول بن جاتی ہیں۔ یہ جب محبوب کو گلے لگا کر آتی ہے تو عاشق کے قریب پہنچ کر ناز وادا سے جھجک بھی جاتی ہے۔ یہ کبھی محبوب کی زلفوں کی خوشبو کو اڑا کر عاشق کے پاس لے جاتی اور اس کے دل کو مہکا دیتی ہے۔ پھولوں کی خوشبوؤں کو گلشن میں بکھیر کر فضا کو معطر کر دیتی ہے۔ یہ بادلوں کو بھی اڑا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہے۔ ان کالے کالے بادلوں کو آسمان میں اڑتے ہوئے دیکھ کر اقبال نے فیلِ بے زنجیر سے خطاب کیا اور ان بادلوں کو جب کالی داس نے دیکھا تو ان کی تخیل کی اڑان تیز سے تیز تر ہوگئی جس کی بدولت سنسکرت کی شاہکار تخلیق ''میگھ دوتم'' وجود میں آئی۔ لیکن ان ہواؤں نے فرید پربتی کے ساتھ اکثر وہی سلوک کیا ہے جو اساطیر پہاڑ 'میرو' کے ساتھ کیا تھا یعنی فرید کے وجود کو مستحکم نہیں ہونے دیا ان کی زندگی کو ہلا کر رکھ دیا۔ فرید پربتی نے ان ظالم ہواؤں سے بچ کر نکلنے کی کبھی کوشش نہیں کی بلکہ ان کا مقابلہ کیا اور اس کے ظلم ستم کو ایک چیلنج کے طور پر لیا اور اپنے قدم کو کبھی ڈگمگانے نہیں دیا۔ اس کے تیز وتند دھار کے ہر وار کو ہنس کر سہا۔ یعنی ہواؤں نے فرید کو زمانے کے طوفان سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ دیا۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

کہاں پہ ٹوٹ گیا ہوں مجھے یہ فکر نہیں
میں سوچتا ہوں کہاں سے گرا گئی ہے ہَوا
بنے بنائے سے رستوں کو ڈھا گئی ہے ہَوا
تمام نقشِ کفِ پا مٹا گئی ہے ہَوا
کہیں پہ سبزہ نہ کوئی نشان پانی کا
نجانے لے کے کہاں مجھ کو آ گئی ہے ہوا
کشتیِ جاں ہو گئی ہے باد باں
اے ہَوا اس طور مت لے امتحان
آگے کی راہ گھیر لی سرکش ہَواؤں نے
واپس بھی لوٹ جانے کی صورت نہیں رہی
نہ پوچھو کس طرح اب تک جلا ہوں
ہَوا کے دوش پر میں اک دیا ہوں

کسی دامن نہ آنچل ہی کا سایہ
ہَواؤں کس نگر میں آ گیا ہوں
تجھ کو کیا دوں گا نہ خوشبو ہے نہ شبنم اور نہ رنگ
میرے دامن میں بجز موجِ ہَوا کے کچھ بھی نہیں
خیال وخواب کے تتلی پروں کو روتے ہیں
اداس صحن میں فتنے جگا گئی ہے ہَوا
تازہ ہَوا سے رشتۂ موسم تو تھا ضرور
بے برگ وبار دل کا مگر ہر درخت تھا

فرید پربتی نے شاعری کے بیشتر اصناف میں طبع آزمائی کی لیکن غزل اور رباعی میں اپنے کمالات کے جوہر خوب دکھائے ہیں۔ان دونوں اصناف کی روایت بہت قدیم ہے۔کلاسیکی اور جدید دور کے نہ جانے کتنے شعرانے ان دونوں اصناف میں اپنے کمالات کا جوہر دکھایا ہے۔ان باکمال شعرا کی بھیڑ میں اگر کوئی شاعر غزل اور رباعی جیسے اصناف میں شعری نزاکت ولطافت کو برقرار رکھتے ہوئے منفرد مقام حاصل کرلے تو یہ بہت بڑی بات ہے۔فرید پربتی کو بھی اس کا احساس تھا کہ انہوں نے ان دونوں اصناف میں اپنا کمال دکھایا ہے:

وہ غزل ہو کہ رباعی ہو دیا تو نے فریدؔ
ایک اک صنف کو اندازِ بیاں ایک نیا

دراصل فرید پربتی نے اساتذہ کے کلام کا کثرت سے مطالعہ کیا تھا۔سنسکرت، فارسی اور اردو کی کلاسیکی شعری روایات کو اپنے اندر جذب کیا، پرانی تشبیہات ،استعارات، علامات اور لفظیات کو نئے معنی ومفہوم عطا کر کے نئے تجربے کے ساتھ شعر کے سانچے میں ڈھال دیا۔اساتذہ کے بعض اشعار کے مفہوم کو نئے انداز اور نئے لب ولہجے میں پیش کیا۔اساتذہ کے بعض قافیوں کا استعمال کیا لیکن ردیف بدل دی۔الغرض غالب نے جس طرح بیدل اور کئی فارسی کے دوسرے شعرا کے خیالات سے استفادہ کیا اسی طرح فرید پربتی نے بھی اساتذہ کے کلام وخیالات سے استفادہ کیا اور اپنا بنا کر نئے تجربے اور نئے رنگ میں پیش کیا۔اسی لیے ان کی شاعری کلاسیکی اور جدید رنگ کی خوبصورت آمیزش ہے۔تخلیقی عمل سے گذرتے ہوئے کلاسیکی اور جدید رنگ کے درمیان توازن برقرار رکھنا بے حد دشوار ہے۔غزل کے عبوری دور کے بعض شعرانے کلاسیکی رنگ غزل سے جب انحراف کیا تو اکثر ان کا لہجہ اُکھڑ گیا اور شعر کی تاثیر ختم ہوگئی لیکن فرید پربتی کی ذہنی تربیت، کلاسیکی رچاؤ اور عصری تہذیبی ومعاشرتی تقاضوں کے شعور نے کلاسیکیت اور جدیدیت کے فرق کو ختم کر دیا۔پروفیسر قدوس جاوید نے بھی 'ہزار امکاں' پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''فرید پربتی کی غزل کلاسیکی غزل کے لسانی اور اظہاری رویوں سے رشتہ قائم رکھتی ہے لیکن دوسری جانب عصری زندگی اور ثقافت کے حوالے سے سوچ اور فکر کو تخلیقی تجربے کے بطور پیش کرنے کی ہنرمندی کے سبب جدید ترین لسانی، فنی اور جمالیاتی شعور کا جواز بھی پیش کرتی ہے۔''

فرید پربتی کو بھی اپنی زبان دانی کا احساس تھا انہوں نے اپنے اشعار میں اکثر اس کا اظہار کیا ہے:

زباں ہے صاف خیالات بھی شگفتہ ہیں

فریدؔ تو نے یہ طرزِ سخن نکالی کیا
بولتی روحِ غنیؔ ہے تیرے شعروں میں فریدؔ
یہ ہمیں اندازہ تیری خوش بیانی سے ہوا

یوں تو فرید پربتی نے تنقید وتحقیق میں بھی اپنا ایک مقام پیدا کرلیا تھا لیکن بنیادی طور پر وہ ایک فطری شاعر تھے۔فرید پربتی کا تعلق بھلے ہی وادیٔ کشمیر سے ہے لیکن انہوں نے اپنے آپ کو علاقائیت کے حصار سے باہر نکال کرخود کو آفاقی شعرا کی صف میں لاکر کھڑا کر دیا تھا۔یہی وہ جذبہ ہے جس کی بدولت ان کی شاعری میں آفاقیت پیدا ہوئی اور انہیں آفاقی شہرت ملی۔انہوں نے اپنے کئی اشعار میں اظہار کیا کہ بھلے ہی ان کا تعلق کشمیر سے ہے لیکن انہیں ہندوستان کا ہر شہر اور خطہ اپنا وطن معلوم ہوتا ہے:

ہوتا ہے دکن میں کبھی دلّی کبھی جموں
رہتا ہے فریدؔ اب نہیں کشمیر میں شاید
ایک سا لگتا ہے مجھ کو ہر دیار
کاشمر ہو وہ کہ دلّی یا دکن

یہی وہ احساس ہے جس کی وجہ سے شاعر کی سوچ میں وسعت پید ہوجاتی ہے۔شاعر کے نجی مسائل،عوامی مسائل سے ہم آہنگ ہوتے ہیں اور شاعر اپنے غموں اور مسائل کو عوامی یا آفاقی بنا کر پیش کرتا ہے۔فرید پربتی نے بھی نجی واقعات وحالات اور علاقائی مسائل کو آفاقی تناظر میں پیش کیا:

چھلنی ہوا ہے جسم مرا پھر بھی دیکھنا
کرتے نہیں ہیں مشق وہ تیر و کماں بند
کھوگئے گاڑھے دھویں میں شہر کے منظر تمام
اک پرندہ رہ گیا آہ و فغاں کرتا ہوا
رونق یہ میرے شہر کی اب لے گیا ہے کون
ایک اک سڑک خموش ہے ایک اک دوکاں بند
میری بستی سے ہے گزرا ایک لشکر اس طرح
دودھ پیتے بچوں پر مشقِ سناں کرتا ہوا

یہ اشعار بھلے ہی کشمیر کے پس منظر میں کہے گئے ہوں لیکن یہ صورتِ حال پوری دنیا میں ہے۔چاہے وہ پاکستان ہو یا افغانستان،عراق ہو یا ایران،فلسطین ہو یا مصر یا شام ہر جگہ جنگ وجدل کا منظر ہے،بچوں اور عورتوں پر مشق سناں جاری ہے۔بارود کے گاڑھے دھنویں میں لپٹا ہوا ہر شہر،چاروں طرف کرفیو،دکانیں بند،سڑکوں پر سناٹا چھایا ہوا ہے۔گھروں سے چیخ پکار اور کراہیں سنائی دے رہی ہیں۔الغرض معلوم ہوتا ہے کہ فرید پربتی کے یہ اشعار آفاقی تناظر میں کہے گئے ہیں۔ایک بڑے شاعر کی یہی پہچان ہے۔

فرید پربتی کی شاعری کے کئی رنگ ہیں جو ان کے تمام شعری مجموعوں میں منعکس ہوتے رہتے ہیں۔ان کی versatility کی دلیل ان کے شعری مجموعے'ابرتر'، 'آبِ نسیاں، 'اثبات'، 'فریدنامہ'، 'گفتگو چاند سے'، 'ہزارامکاں'، 'خبرِ تحیر'اور ' ہجوم آئینہ'ہیں۔ان کی تنقیدی کتابوں میں 'شہ

زورکشمیری (تلمذ سیماب اکبرآبادی) حیات وفن، 'انتقادواصلاح'، 'صنف رباعی'، 'داغ بحیثیت مثنوی نگار'اور 'تنقید رباعی شائع ہوئیں ۔ان کی آخری کتاب ''شہ زورکشمیری (تلمذ سیماب اکبرآبادی) حیات وفن'' ترمیم واضافہ کے بعد شائع ہوئی لیکن جب یہ کتاب شائع ہوکرآئی اس وقت فرید پربتی اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ ''شاعر''ممبئی میں 2005اور 2011 میں فرید پربتی کے اعتراف میں گوشے شائع ہو چکے ہیں۔اس کے علاوہ جناب سلیم سالک نے 2006 میں ''فرید پربتی :شعرشعورشعریات''اورڈاکٹرمشتاق حیدراورشاہ فیصل نے 2011 میں ''فرید پربتی :تنقید،تخلیق اورتفکر'' کے عنوانات سے ایک ایک کتاب مرتب کی تھی۔مختصر یہ کہ فرید پربتی کشمیر کے ایک Versatile شاعروادیب تھے۔ان کی شخصیت اوران کے ادبی کارناموں کو ہمیشہ قدرومنزلت سے دیکھا جائے گا۔

Residence: 262-D, Shipra Sun City, Indirapuram, Ghaziabad-201014
Mobile No: 09911796525
Website:people.du.ac.in/~aahmad